ALLAMA IQBAL OPEN UNIVERSITY

USMAN NOTES
www.usmannotes.com

Name:

Registration No.:

Course Code: 2625

Program: M.A. Islamic Studies

Semester: Autumn 2026

علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

کلیۂ عربی وعلوم اسلامیہ (شعبۂ فکر اسلامی، تاریخ وثقافت)

کورس: اسلام کا اقتصادی نظام (2625)

مطلوبہ: بی اے/ایم اے علوم اسلامیہ

سمسٹر: خزاں 2026ء (Autumn 2026)

امتحانی مشق نمبر 1 (یونٹ نمبر 1–4)

کل نمبر: 100 — کامیابی کے نمبر: 40

Reference &For Study — SOLVED ASSIGNMENT GUIDE

نوٹ: یہ حل شدہ گائیڈ صرف مطالعے اور رہنمائی کے لیے ہے۔ طلبہ جوابات کو اپنے الفاظ میں، اپنی سمجھ کے مطابق تحریر کریں؛ ہو بہو نقل کرنا مناسب نہیں اور یونیورسٹی کی ہدایات کے خلاف بھی ہو سکتا ہے۔

USMAN NOTES www.usmannotes.com

سوال نمبر 1: اسلامی معاشیات کی تعریف اور اس کی امتیازی خصوصیات بیان کیجیے۔ (20)

تعارف

اسلامی معاشیات سے مراد وہ علم اور نظام ہے جو اسلام کے بنیادی ماخذ یعنی قرآن و سنت اور ان سے مستنبط فقہی اصولوں کی روشنی میں انسان کی معاشی زندگی کو منظم کرتا ہے۔ عام معاشیات عام طور پر وسائل کی کمی، طلب و رسد اور پیداوار و تقسیم جیسے مسائل کو اخلاقی اقدار سے الگ کر کے زیرِ بحث لاتی ہے، جبکہ اسلامی معاشیات ابتدا ہی سے معاشی سرگرمی کو عبادت، امانت اور اخروی جواب دہی سے جوڑتی ہے۔ اس کے نزدیک مال بذاتِ خود مقصود نہیں بلکہ انسان کی ضروریات کی تکمیل، معاشرے کی فلاح اور اللہ تعالیٰ کی رضا کے حصول کا ذریعہ ہے۔ یہی بنیادی فرق اسلامی معاشیات کو سرمایہ دارانہ اور اشتراکی نظاموں سے ممتاز کرتا ہے اور اسے ایک متوازن، انسانی اور اخلاقی نظام بناتا ہے۔

دورِ حاضر میں جب دنیا سود، استحصال، دولت کی غیر منصفانہ تقسیم اور معاشی عدم استحکام جیسے مسائل سے دوچار ہے تو اسلامی معاشیات کی اہمیت اور بڑھ جاتی ہے۔ یہ نظام نہ تو فرد کو مکمل آزاد چھوڑتا ہے کہ وہ جس طرح چاہے دولت سمیٹے اور نہ ہی ریاست کو اس قدر غالب بناتا ہے کہ فرد کی محنت اور جائز ملکیت ہی ختم ہو جائے۔ اس کے بجائے یہ اعتدال کی راہ اختیار کرتا ہے جس میں نجی ملکیت بھی تسلیم کی جاتی ہے، بازار بھی کام کرتا ہے، لیکن ہر معاشی عمل حلال و حرام، عدل و انصاف اور سماجی ذمہ داری کی حدود میں رہتا ہے۔ اس جواب میں پہلے اسلامی معاشیات کی تعریف مختلف پہلوؤں سے بیان کی جائے گی اور پھر اس کی نمایاں امتیازی خصوصیات کو تفصیل سے واضح کیا جائے گا۔

اسلامی معاشیات کی تعریف

لغوی اعتبار سے معاشیات کا تعلق معاش یعنی روزی روٹی اور زندگی گزارنے کے وسائل سے ہے۔ اصطلاح میں اسلامی معاشیات وہ علم ہے جو شریعت کے اصولوں کے مطابق پیداوار، تبادلہ، تقسیم اور صرف دولت کے مسائل کا مطالعہ کرتا ہے اور بتاتا ہے کہ محدود وسائل کو انسانی ضروریات کی تکمیل کے لیے کس طرح منصفانہ اور جائز طریقے سے استعمال کیا جائے۔ اس تعریف میں تین باتیں خاص طور پر قابلِ توجہ ہیں۔ اول یہ کہ وسائل کو اللہ کی عطا اور امانت سمجھا جاتا ہے۔ دوم یہ کہ ہر معاشی فیصلہ شریعت کی مقرر

کردہ حدود کے اندر رہوتا ہے۔ سوم یہ کہ انفرادی فائدے کے ساتھ اجتماعی فلاح کو بھی سامنے رکھا جاتا ہے۔ اس لیے اسلامی معاشیات محض نظریات کا مجموعہ نہیں بلکہ ایک عملی طرز زندگی ہے۔

مفکرین نے اسلامی معاشیات کی تعریف اپنے اپنے انداز میں کی ہے لیکن سب کا مرکزی نکتہ ایک ہی ہے کہ معاشی زندگی کو وحی کی ہدایت سے منظم کیا جائے۔ بعض نے اسے قرآن و سنت کی روشنی میں معاشی مسائل کے حل کا علم قرار دیا ہے جبکہ بعض نے اسے انسانی رویے کا وہ مطالعہ کہا ہے جو اسلامی اقدار کے تابع ہو۔ ان تعریفوں کا خلاصہ یہ ہے کہ اسلامی معاشیات میں انسان کو خود مختار مالک نہیں بلکہ خلیفہ اور امین سمجھا جاتا ہے۔ وہ مال کماتا ہے، خرچ کرتا ہے اور بچاتا ہے لیکن ہر مرحلے پر اسے یہ احساس رہتا ہے کہ اصل مالک اللہ تعالیٰ ہے اور اسے اپنے مال کے بارے میں جواب دینا ہے۔ یہی تصور اسلامی معاشیات کی روح ہے اور اسی سے اس کی تمام خصوصیات جنم لیتی ہیں۔

توحید، رسالت اور آخرت کی بنیاد

اسلامی معاشیات کی پہلی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ اس کی بنیاد عقیدہ توحید پر ہے۔ کائنات اور اس کے تمام وسائل کا خالق اور مالک حقیقی اللہ تعالیٰ ہے اور انسان اس کا نائب ہے۔ اس عقیدے کا عملی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ انسان مال کو اپنی بے لگام ملکیت نہیں سمجھتا بلکہ اسے امانت جان کر مقررہ حدود میں استعمال کرتا ہے۔ اسی طرح رسالت کا عقیدہ معاشی زندگی کو عملی نمونہ فراہم کرتا ہے کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت میں تجارت، دیانت، مزدور کے حقوق اور کمزوروں کی کفالت کے روشن اصول ملتے ہیں۔ آخرت کا عقیدہ انسان کو طویل المیعاد سوچ دیتا ہے۔ جو شخص یہ یقین رکھے کہ اسے ایک دن اپنے کمائے اور خرچ کیے ہوئے مال کا حساب دینا ہے وہ ناجائز ذرائع اختیار کرنے سے بچتا ہے اور یہی اندرونی نگرانی اسلامی نظام کو خارجی قوانین سے زیادہ مؤثر بناتی ہے۔

اس کے برعکس مادی نظاموں میں معاشی انسان کو صرف اپنے نفع کا طالب فرض کیا جاتا ہے۔ ایسا انسان قانون سے بچ نکلنے کی صورت میں ہر طریقہ اختیار کر سکتا ہے۔ اسلامی معاشیات اس تصور کو رد کرتی ہے اور انسان کو اخلاقی وجود قرار دیتی ہے جس کی خواہشات بھی ہیں اور ضمیر بھی۔ اس لیے اس نظام میں تعلیم و تربیت، قانون اور ضمیر تینوں مل

کر کام کرتے ہیں۔ جب بازار میں تاجر یہ سمجھتا ہے کہ ناپ تول میں کمی صرف جرم نہیں گناہ بھی ہے تو معاشرے میں اعتماد پیدا ہوتا ہے، لین دین کے اخراجات کم ہوتے ہیں اور معیشت مستحکم ہوتی ہے۔ یہ اخلاقی بنیاد اسلامی معاشیات کی سب سے بڑی طاقت ہے جو اسے محض تکنیکی نظام کے بجائے تہذیبی نظام بناتی ہے۔

حلال و حرام کی پابندی اور سود کی ممانعت

دوسری بڑی خصوصیت حلال و حرام کا واضح تصور ہے۔ اسلامی معاشیات میں ہر وہ ذریعہ آمدن ممنوع ہے جو دھوکے، جبر، جوئے، سٹے، رشوت، ملاوٹ، ذخیرہ اندوزی یا سود پر مبنی ہو۔ اس کے مقابلے میں تجارت، زراعت، صنعت، ملازمت اور جائز خدمات جیسے ذرائع کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے کیونکہ یہ حقیقی پیداوار اور باہمی رضامندی پر قائم ہوتے ہیں۔ سود کی ممانعت اس نظام کا مرکزی ستون ہے۔ سود میں ایک فریق کا نفع یقینی ہوتا ہے جبکہ دوسرا فریق خطرہ بھی اٹھاتا ہے اور بوجھ بھی۔ اس سے دولت چند ہاتھوں میں سمٹتی ہے، قرض دار پس جاتا ہے اور معاشرے میں طبقاتی کشمکش بڑھتی ہے۔ اسلام سود کے بجائے مضاربہ اور مشارکہ جیسے نفع و نقصان میں شراکت والے طریقوں کو فروغ دیتا ہے تاکہ سرمایہ اور محنت دونوں انصاف کے ساتھ شریک ہوں۔

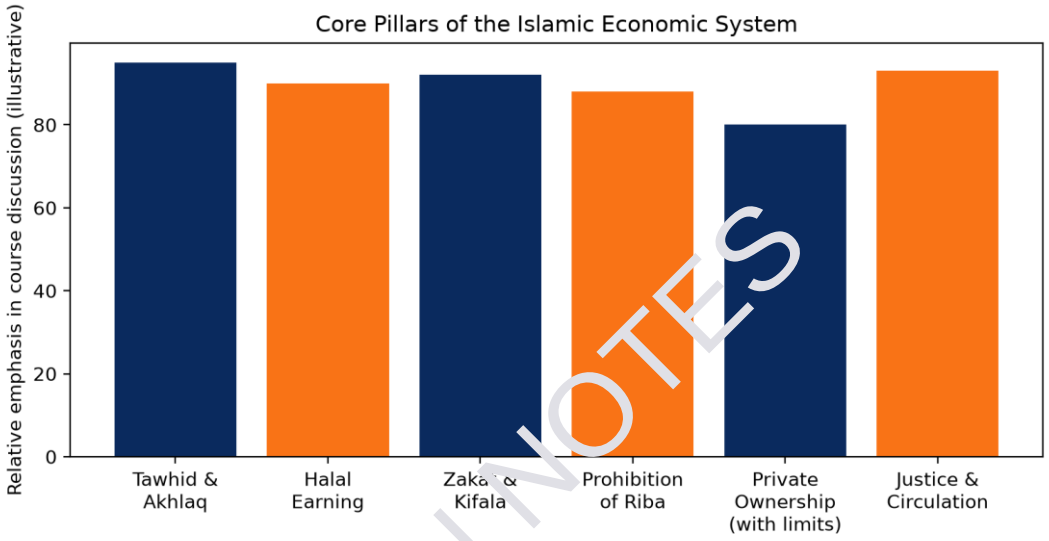
جدول: اسلامی معاشیات اور مروجہ نظاموں کا مختصر تقابل

پہلو	اسلامی معاشیات	سرمایہ داری	اشتراکیت
ملکیت	اللہ مالک حقیقی، انسان امین؛ محدود نجی ملکیت	مطلق نجی ملکیت	ریاستی ملکیت
سود	ممنوع	بنیاد	ریاستی نظام میں ثانوی
تقسیم دولت	زکاۃ، صدقات اور کفالت سے گردش	بازار پر منحصر	ریاستی تقسیم
اخلاقی حدود	حلال و حرام کی پابندی	عموماً غیر متعلق	عموماً غیر متعلق

حلال و حرام کی اس پابندی کا ایک اہم پہلو یہ بھی ہے کہ اسلام صرف ذریعہ آمدن کو نہیں دیکھتا بلکہ خرچ کو بھی دیکھتا ہے۔ فضول خرچی، نمود و نمائش اور حرام اشیا پر خرچ ممنوع ہے جبکہ اعتدال، کفایت شعاری اور ضرورت مندوں پر خرچ پسندیدہ ہے۔ اس طرح پیداوار سے لے کر کھپت تک پورا معاشی چکر اخلاقی دائرے میں رہتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وسائل ضائع نہیں ہوتے، فحاشی اور عیاشی کی حوصلہ شکنی ہوتی ہے اور معاشرے کی اصل ضروریات پوری ہونے لگتی ہیں۔ یہ جامع اخلاقی نگرانی کسی اور نظام میں اس صورت میں موجود نہیں ہے۔

عدل، توازن اور دولت کی گردش

اسلامی معاشیات کی تیسری خصوصیت عدل اور توازن ہے۔ اسلام چاہتا ہے کہ دولت صرف امیروں ہی میں گردش نہ کرتی رہے بلکہ معاشرے کے تمام طبقات تک پہنچے۔ اس مقصد کے لیے زکاۃ، عشر، صدقات، وراثت کے قوانین اور وقف جیسے ادارے قائم کیے گئے ہیں۔ وراثت کا نظام دولت کو ایک ہی وارث کے پاس جمع ہونے سے روکتا ہے اور اسے کئی رشتہ داروں میں تقسیم کر دیتا ہے۔ زکاۃ ہر سال دولت کا ایک حصہ ضرورت مندوں کی طرف منتقل کرتی ہے۔ وقف تعلیم، صحت اور فلاح کے مستقل ادارے کھڑا کرتا ہے۔ ان تمام ذرائع سے دولت کی گردش جاری رہتی ہے اور غربت میں کمی آتی ہے۔ یہ نظام خیرات کو احسان نہیں بلکہ مال میں شامل کمزوروں کا حق قرار دیتا ہے جس سے لینے والے کی عزت نفس بھی محفوظ رہتی ہے۔



شکل: اسلامی معاشی نظام کے بنیادی ستون (مطالعے کے لیے مثیلی خاکہ)

توازن کا مطلب یہ بھی ہے کہ اسلام انفرادیت اور اجتماعیت دونوں کا لحاظ رکھتا ہے۔ فرد کو محنت، تجارت اور جائز منافع کی ترغیب دی جاتی ہے تاکہ اس میں آگے بڑھنے کا جذبہ باقی رہے۔ ساتھ ہی اس پر سماجی ذمہ داریاں عائد کی جاتی ہیں تاکہ اس کی آزادی دوسروں کے استحصال کا ذریعہ نہ بنے۔ ریاست کو بھی محدود مگر اہم کردار دیا گیا ہے۔ وہ بازار کی نگرانی کرتی ہے، ناپ تول اور قیمتوں میں ظلم کو روکتی ہے، بنیادی ضروریات کی فراہمی یقینی بناتی ہے اور ظلم کی صورت میں مداخلت کرتی ہے۔ یوں فرد، معاشرہ اور ریاست تینوں ایک متوازن نظام میں جڑ جاتے ہیں اور کوئی ایک عنصر دوسروں کو کچل نہیں پاتا۔

حقیقی معیشت، محنت کی عزت اور سماجی فلاح

چوتھی خصوصیت یہ ہے کہ اسلامی معاشیات حقیقی معیشت پر زور دیتی ہے۔ یہاں دولت کا مطلب کاغذی لین دین اور قیاسی سودے نہیں بلکہ اصل پیداوار، اصل خدمات اور اصل تجارت ہے۔ کسان کی فصل، کاریگر کی محنت، تاجر کی دیانت دار تجارت اور استاد و طبیب کی خدمات سب کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ محنت کی عزت اسلامی تعلیمات کا نمایاں پہلو ہے۔ مزدور کو اس کی مزدوری پسینہ خشک ہونے سے پہلے دینے کی تاکید اس بات کی دلیل ہے کہ اسلام محنت کو سرمایہ سے کمتر نہیں سمجھتا۔ اسی طرح ہاتھ سے کمانے کو افضل قرار دینا معاشرے میں خود داری پیدا کرتا ہے اور بھیک اور سستی کی حوصلہ شکنی کرتا ہے۔ محنت کی یہ عزت پیداوار بڑھاتی ہے اور معاشرے کو خود کفیل بناتی ہے۔

سماجی فلاح اس نظام کا حتمی مقصد ہے۔ اسلامی معاشیات کی کامیابی کا پیمانہ صرف قومی آمدنی میں اضافہ نہیں بلکہ یہ ہے کہ معاشرے کے کمزور ترین فرد کی بنیادی ضروریات یعنی خوراک، لباس، رہائش، تعلیم اور علاج کس حد تک پوری ہو رہی ہیں۔ اسی لیے اس نظام میں ہر فرد کی کفالت کو اجتماعی ذمہ داری قرار دیا گیا ہے۔ جب امیر زکاۃ دیتا ہے، ریاست بیت المال سے مدد کرتی ہے اور ہمسایہ اپنے پڑوسی کا خیال رکھتا ہے تو ایک مضبوط سماجی حفاظتی جال بنتا ہے۔ یہ فلاحی پہلو اسلامی معاشیات کو خالص کاروباری نظام سے الگ کرتا ہے اور اسے انسانی ہمدردی کا نظام بناتا ہے۔

نتیجہ

خلاصہ یہ ہے کہ اسلامی معاشیات وحی کی رہنمائی میں چلنے والا ایک جامع، اخلاقی اور متوازن نظام ہے جس کی تعریف میں امانت، خلیفہ کا تصور، حلال و حرام کی پابندی اور اجتماعی فلاح شامل ہیں۔ اس کی امتیازی خصوصیات میں توحید و آخرت کی بنیاد، سود اور استحصالی ذرائع کی ممانعت، نجی ملکیت پر اخلاقی و قانونی حدود، زکاۃ و وراثت کے ذریعے دولت کی گردش، محنت کی عزت، حقیقی پیداوار پر زور اور کمزوروں کی کفالت شامل ہیں۔ یہ خصوصیات مل کر ایک ایسا معاشرہ تشکیل دیتی ہیں جہاں خوشحالی بھی ہو اور انصاف بھی، آزادی بھی ہو اور ذمہ داری بھی۔ آج کی دنیا کے معاشی بحران بار بار یہ ثابت کر رہے ہیں کہ اخلاق سے خالی معیشت دیر پا نہیں ہو سکتی، اس لیے اسلامی معاشیات کا مطالعہ اور اس کے اصولوں کا نفاذ وقت کی اہم ضرورت ہے۔

آخر میں یہ بات بھی واضح رہنی چاہیے کہ اسلامی معاشیات کوئی جامد اور غیر لچک دار نظام نہیں ہے۔ اس کے بنیادی اصول اٹل ہیں لیکن ان کے اطلاق کی صورتیں زمانے کے تقاضوں کے مطابق بدل سکتی ہیں۔ جدید بینکاری، انشورنس کی متبادل صورتیں، کارپوریٹ نظام اور ڈیجیٹل تجارت جیسے مسائل پر اجتہاد کی گنجائش موجود ہے بشرطیکہ بنیادی اصول یعنی سود، غرر اور ظلم کی ممانعت مجروح نہ ہو۔ یہی لچک اور اصول پسندی کا امتزاج اسلامی معاشیات کو ہر دور کے لیے قابل عمل بناتا ہے۔ طالب علم کے لیے ضروری ہے کہ وہ ان خصوصیات کو محض نظری معلومات نہ سمجھے بلکہ اپنی عملی زندگی میں دیانت، اعتدال اور انصاف کی صورت میں اپنائے، کیونکہ نظام کی اصل کامیابی افراد کے کردار سے ہی ممکن ہوتی ہے۔

سوال نمبر2: اسلامی شریعت میں حرام ذرائع کسب کی وضاحت کیجیے۔(20)

تعارف

اسلام نے انسان کی معاشی زندگی کو مکمل آزادی نہیں دی بلکہ کسب معاش کے لیے حلال اور حرام کی واضح حد بندی کی ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ مال انسان کے اخلاق،عبادت اور معاشرتی تعلقات پر گہرا اثر ڈالتا ہے۔ حرام مال سے پرورش پانے والا معاشرہ بے برکتی، ظلم اور بے چینی کا شکار ہو جاتا ہے جبکہ حلال روزی سکون، برکت اور اعتماد پیدا کرتی ہے۔اسلامی شریعت میں حرام ذرائع کسب سے مراد وہ تمام طریقے ہیں جن سے حاصل ہونے والی آمدن قرآن وسنت کی صریح ممانعت، دھوکے، ظلم، دوسروں کے حق کی تلفی یا معاشرتی ضرر کی وجہ سے ناجائز قرار دی گئی ہو۔ان ذرائع کی وضاحت اس لیے بھی ضروری ہے کہ بہت سے لوگ لاعلمی میں یا منافع کی لالچ میں ایسے کاروبار اختیار کر لیتے ہیں جو بظاہر عام تجارت لگتے ہیں لیکن شریعت کی نظر میں حرام ہوتے ہیں۔

حرام ذرائع کو سمجھنے کا بنیادی اصول یہ ہے کہ ہر وہ لین دین جس میں کسی فریق کا نقصان یقینی ہو، فریب ہو، جبر ہو یا ایسی چیز کی خرید و فروخت ہو جسے شریعت نے بذات خود حرام قرار دیا ہو، وہ ناجائز ہے۔اس کے علاوہ وہ آمدن بھی حرام ہے جو معاشرے میں فساد، نشہ، فحاشی یا جرائم کو فروغ دے۔اس جواب میں سود، جوا، رشوت، چوری و غصب، دھوکا وملاوٹ، ذخیرہ اندوزی، ناجائز اجارہ داری اور حرام اشیا کی تجارت جیسے اہم حرام ذرائع کو الگ الگ عنوانات کے تحت واضح کیا جائے گا اور ساتھ یہ بھی بتایا جائے گا کہ شریعت نے ان کی ممانعت کیوں کی اور ان کے معاشرتی نقصانات کیا ہیں۔ یہ بحث خالص علمی و تعلیمی مقصد کے لیے ہے؛ کسی مخصوص فرد یا معاملے پر شرعی حکم کا اطلاق اہل علم اور مجاز اداروں کا کام ہے۔

سود یعنی ربا

حرام ذرائع میں سب سے نمایاں اور شدید گناہ سود ہے۔ سود سے مراد قرض پر اصل رقم سے زائد کا پہلے سے طے شدہ مطالبہ یا ایسا لین دین ہے جس میں ایک فریق کو بغیر حقیقی خطرے اور محنت کے یقینی اضافہ ملے۔ قرآن مجید نے سود کو اللہ اور اس کے رسول کے خلاف جنگ سے تعبیر کر کے اس کی سنگینی واضح کی ہے اور سنت نے سودی لین دین کے

تمام اطراف کو قابل مذمت قرار دیا ہے۔ سود کے نقصانات معاشی اور اخلاقی دونوں ہیں۔ معاشی لحاظ سے یہ دولت کو قرض دینے والے چند سرمایہ داروں کی طرف کھینچتا ہے، پیداواری سرمایہ کاری کی حوصلہ شکنی کرتا ہے کیونکہ سرمایہ دار بغیر خطرے کے منافع پانے لگتا ہے، اور قرض دار کو اصل سے کئی گنا ادائیگی کے بوجھ تلے دبا دیتا ہے۔ اخلاقی لحاظ سے یہ خود غرضی، بے رحمی اور دولت پرستی کو فروغ دیتا ہے اور ضرورت مند کی مجبوری سے فائدہ اٹھانے کو معمول بنا دیتا ہے۔

سود کی ممانعت کا مطلب قرض اور مدد کا دروازہ بند کرنا نہیں ہے۔ اسلام قرضِ حسنہ کی ترغیب دیتا ہے، تنگ دست کو مہلت دینے اور معاف کرنے کو صدقہ قرار دیتا ہے اور کاروباری ضرورت کے لیے مضاربہ، مشارکت، مرابحہ اور اجارہ جیسی جائز شراکتی صورتیں پیش کرتا ہے جن میں نفع کے ساتھ نقصان کا خطرہ بھی بانٹا جاتا ہے۔ اس فرق کو سمجھنا ضروری ہے کہ تجارت میں منافع اس لیے حلال ہے کہ تاجر مال خریدتا ہے، خطرہ اٹھاتا ہے اور بازار کی ذمہ داری قبول کرتا ہے، جبکہ سود میں قرض خواہ کوئی خطرہ نہیں اٹھاتا۔ یہی خطرے کی شراکت عدل کا تقاضا ہے۔ جدید دور میں بینکوں کے سودی نظام کو اسی اصول پر پرکھا جاتا ہے اور اسلامی بینکاری اسی متبادل تلاش کی عملی کوشش ہے جس کا ذکر آگے کے سوالات میں بھی آئے گا۔

جوا، سٹہ اور غرر والے سودے

جوا اور سٹہ بھی حرام ذرائع کسب میں شامل ہیں۔ جوئے میں ایک شخص کا مال محض اتفاق اور قسمت کی بنیاد پر دوسرے کے پاس چلا جاتا ہے، نہ اس میں حقیقی پیداوار ہوتی ہے اور نہ باہمی خدمت۔ اس سے محنت کی حوصلہ شکنی، دشمنی، گھریلو تباہی اور نشے جیسی برائیاں پیدا ہوتی ہیں۔ قرآن نے شراب کے ساتھ جوئے کو بھی شیطانی عمل قرار دے کر اس سے اجتناب کا حکم دیا ہے۔ اسی ذیل میں لاٹری، انعامی اسکیموں کی وہ صورتیں اور سٹہ بازی آتی ہے جہاں نفع کا مدار مہارت اور خدمت کے بجائے محض اندازے اور موقع پر ہو۔ جدید مالیاتی بازاروں میں بھی وہی سودے قابل اعتراض ہوتے ہیں جن میں خریدی جانے والی چیز موجود ہی نہ ہو یا معاملہ انتہائی غیر یقینی ہو۔

غرر سے مراد ایسا معاملہ ہے جس میں خریدی جانے والی چیز، اس کی مقدار، قیمت یا حوالگی غیر واضح اور دھوکے کا شکار ہو۔ مثال کے طور پر ایسی چیز بیچنا جو بیچنے والے کے پاس موجود ہی نہیں، مچھلی کو پانی میں رہتے ہوئے بیچ دینا یا ایسا سودا جس کی شرائط بعد میں جھگڑے کا سبب بنیں، یہ سب غرر میں آتے ہیں۔ شریعت نے بیع کو واضح، معلوم اور باہمی

رضامندی والا بنانے پر زور دیا ہے تاکہ نہ خریدار دھوکا کھائے اور نہ بیچنے والا۔ اس اصول کی روشنی میں جدید معاہدوں میں شرائط کی شفافیت، مکمل معلومات کی فراہمی اور پوشیدہ عیب بتانا ضروری ہے۔ جو کاروبار جان بوجھ کر ابہام رکھ کر فائدہ اٹھاتا ہے وہ اسی حرام ذریعے کے قریب ہو جاتا ہے۔

رشوت، چوری، غصب اور ناجائز قبضہ

رشوت وہ مال ہے جو کسی عہدے دار یا فیصلہ کرنے والے کو اس لیے دیا جائے کہ وہ حق کے خلاف فیصلہ کرے یا ناجائز کام کر دے۔ شریعت نے رشوت دینے اور لینے دونوں کو لعنت کا مستحق قرار دیا ہے کیونکہ یہ عدل کے نظام کو جڑ سے کھوکھلا کرتی ہے۔ رشوت سے میرٹ ختم ہوتا ہے، حقدار محروم رہتا ہے اور نااہل آگے آ جاتا ہے۔ اسی طرح کسی کے جائز حق کو دبانے کے عوض لیا گیا مال، سرکاری وسائل کا ذاتی استعمال اور اختیارات کے بدلے حاصل کی گئی کمائی بھی اسی قبیل سے ہے۔ معاشرے میں جب رشوت عام ہو جائے تو غریب کے لیے انصاف خواب بن جاتا ہے اور ریاست پر اعتماد ختم ہو جاتا ہے، اسی لیے اسلام نے اسے کسب کا ذریعہ بنانے کو سختی سے روکا ہے۔

چوری، ڈاکا، غصب اور خیانت بھی واضح حرام ذرائع ہیں۔ چوری میں چھپ کر، غصب میں زبردستی اور خیانت میں امانت رکھ کر دوسرے کا مال کھایا جاتا ہے۔ یتیم کا مال کھانا، ناپ تول میں کمی کرنا اور وراثت میں کمزوروں کا حصہ دبانا بھی اسی ظلم کی صورتیں ہیں۔ ان ذرائع کی مشترکہ علت دوسرے کے حق پر ناجائز قبضہ ہے۔ اسلام ملکیت کا احترام کرتا ہے اور مال حاصل کرنے کا صرف وہی طریقہ جائز مانتا ہے جو مالک کی رضامندی اور جائز تبادلے سے ہو۔ اس اصول سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ کاغذی کارروائی یا قانونی چالاکی سے کسی کا حق مار لینا بھی اخلاقی اور شرعی لحاظ سے اسی زمرے میں آتا ہے، کیونکہ شریعت ظاہری صورت کے ساتھ معاملے کی حقیقت کو بھی دیکھتی ہے۔

دھوکا، ملاوٹ، ذخیرہ اندوزی اور ناجائز منافع خوری

تجارت میں دھوکا دینا بھی حرام کسب ہے۔ عیب دار مال کو درست ظاہر کر کے بیچنا، جعلی برانڈ لگانا، پرانے مال کو نیا کہنا، مقدار کم دینا اور جھوٹی تشہیر سے گاہک کو گمراہ کرنا سب دھوکے کی صورتیں ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ملاوٹ کرنے والے کو اپنی امت کے اخلاقی معیار سے خارج قرار دے کر اس عمل کی قباحت واضح کی ہے۔ ملاوٹ صرف مال کی نہیں ہوتی، ادویات اور خوراک میں ملاوٹ انسانی جان کے لیے خطرہ بنتی ہے اس لیے اس کا گناہ اور نقصان اور بھی بڑا ہے۔ اسی طرح ناپ تول میں کمی کو قرآن نے

تباہی کا سبب قرار دیا ہے کیونکہ یہ پورے بازار کے اعتماد کو ختم کر دیتی ہے۔ دیانت دار تجارت کے لیے ضروری ہے کہ مال کی حقیقت، عیب اور مقدار پوری وضاحت سے بیان کی جائے۔

جدول: اہم حرام ذرائع کسب اور ان کی علت

حرام ذریعہ	بنیادی علت	بڑا معاشرتی نقصان
سود	بغیر خطرے یقینی اضافہ، ظلم	دولت کا ارتکاز، قرض کا جال
جوا و سٹہ	اتفاق پر مال کی منتقلی	محنت کی حوصلہ شکنی، گھریلو تباہی
رشوت	عدل کی خرید و فروخت	میرٹ اور اعتماد کا خاتمہ
چوری و غصب	دوسرے کے حق پر قبضہ	بدامنی اور عدم تحفظ
دھوکا و ملاوٹ	فریب اور ضرر	بازار سے اعتماد کا خاتمہ
ذخیرہ اندوزی	مصنوعی قلت پیدا کرنا	مہنگائی اور عوامی پریشانی

ذخیرہ اندوزی یعنی احتکار اس وقت حرام صورت اختیار کرتی ہے جب تاجر ضرورت کی اشیا خصوصاً غذائی اجناس کو اس نیت سے روک لے کہ قلت پیدا ہو اور قیمتیں بڑھیں تو وہ فروخت کرے۔ اس عمل میں تاجر کا منافع عوام کی مجبوری سے جنم لیتا ہے اس لیے اسے ظلم قرار دیا گیا ہے۔ اسی طرح چند بڑے تاجروں کا مل کر قیمت طے کر لینا اور مقابلہ ختم کر کے عوام کو مہنگا خریدنے پر مجبور کرنا ناجائز اجارہ داری کی صورت ہے۔ اسلام بازار کی آزادی کا قائل ہے لیکن ایسی آزادی کا نہیں جو کمزور کے استحصال پر ختم ہو۔ ریاست کا فرض ہے کہ وہ محتسب کے ادارے کے ذریعے ان حرام طریقوں کی نگرانی کرے اور عوام کو تحفظ دے۔

حرام اشیا کی تجارت اور فحش و ضرر رساں خدمات

وہ اشیا جن کا استعمال شریعت میں بذات خود حرام ہے، ان کی خرید و فروخت سے حاصل آمدن بھی حرام ہے۔ شراب اور نشہ آور اشیا، سور اور اس کی مصنوعات اور مردار وغیرہ اس کی معروف مثالیں ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان اشیا سے معاشرے کو جسمانی، اخلاقی اور سماجی نقصان پہنچتا ہے اور ان کی تجارت اس نقصان کو پھیلانے کا ذریعہ بنتی ہے۔ اسی اصول کے تحت وہ خدمات بھی ناجائز آمدن دیتی ہیں جو فحاشی، عریانی، جھوٹ، فریب یا جرائم کی معاونت پر مبنی ہوں۔ آمدن کی حلت صرف اس بات سے نہیں پرکھی جاتی کہ کام کرنے والے نے محنت کی ہے بلکہ یہ بھی دیکھا جاتا ہے کہ اس محنت کا مقصد اور نتیجہ کیا ہے۔ نقصان دہ مقصد کے لیے کی گئی محنت حلال کسب نہیں بن سکتی۔

اس بحث کا ایک اہم پہلو آمدن کے مخلوط ہونے کا ہے۔ جدید دور میں بہت سے اداروں کا کاروبار حلال اور حرام عناصر کا مرکب ہوتا ہے۔ ایسی صورتوں میں فقہا نے تفصیلی اصول وضع کیے ہیں جن کا اطلاق ہر معاملے کی نوعیت دیکھ کر ہوتا ہے۔ طالب علم کے لیے عمومی رہنمائی یہی ہے کہ غالب کام غالب اور ظاہر پہلو حرام ہو اس سے اجتناب کیا جائے، مشتبہ صورتوں میں اہل علم سے رجوع کیا جائے اور تقویٰ کا تقاضا یہ ہے کہ مشکوک آمدن پر حلال اور یقینی آمدن کو ترجیح دی جائے۔ یہاں کسی فرد کے مخصوص کاروبار پر فتویٰ دینا اس گائیڈ کا مقصد نہیں، مقصد صرف اصولوں کی تعلیمی وضاحت ہے تاکہ طالب علم حلال و حرام میں فرق پہچان سکے۔

نتیجہ

نتیجے کے طور پر کہا جا سکتا ہے کہ اسلامی شریعت نے حرام ذرائع کسب کو چند بنیادی علتوں کی بنیاد پر واضح کیا ہے: ظلم، فریب، غرر، دوسرے کے حق پر قبضہ، معاشرتی ضرر اور بذات خود حرام اشیا و اعمال کی ترویج۔ سود، جوا، رشوت، چوری، غصب، خیانت، ملاوٹ، دھوکا، ذخیرہ اندوزی اور حرام اشیا کی تجارت سب انہی علتوں کے تحت آتے ہیں۔ ان کی ممانعت کا مقصد انسان کو تنگ کرنا نہیں بلکہ اس کی روزی کو پاک، معاشرے کو پرامن اور بازار کو بااعتماد بنانا ہے۔ حرام سے بچنے والا معاشرہ سست ضرور ہو سکتا ہے وقتی چمک میں، لیکن دیرپا خوشحالی، انصاف اور سکون اسی کا مقدر بنتے ہیں۔ اس لیے مسلمان تاجر، ملازم اور سرمایہ کار کے لیے ضروری ہے کہ وہ منافع سے پہلے حلت کو دیکھے کیونکہ برکت حلال میں ہے، محض مقدار میں نہیں۔

سوال نمبر 3: آجر اور اجیر کے باہمی حقوق و فرائض اسلامی تعلیمات کی روشنی میں بیان کیجیے۔ (20)

تعارف

آجر اور اجیر کا تعلق معاشی زندگی کے بنیادی تعلقات میں سے ہے۔ آجر وہ ہے جو کام کراتا ہے اور اجرت دیتا ہے جبکہ اجیر وہ ہے جو اپنی محنت، مہارت اور وقت پیش کر کے اجرت حاصل کرتا ہے۔ جدید اصطلاح میں یہی تعلق مالک اور مزدور، آجر اور ملازم یا ادارے اور کارکن کے درمیان پایا جاتا ہے۔ اسلام نے اس تعلق کو طاقت اور مجبوری کے بجائے عدل، احسان اور باہمی ذمہ داری پر قائم کیا ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام میں اکثر مزدور کو پیداوار کا محض پرزہ سمجھا گیا جس سے استحصال پیدا ہوا، جبکہ اشتراکی ردعمل میں مالک کے جائز حقوق نظر انداز ہوئے۔ اسلام دونوں انتہاؤں سے ہٹ کر متوازن تعلیم دیتا ہے جس میں آجر و مزدور کا حق فوراً اور عزت سے ادا کرنے کا پابند بنایا گیا ہے اور اجیر کو دیانت اور مکمل کارکردگی کا حکم دیا گیا ہے۔

اس موضوع کی اہمیت آج اور بڑھ گئی ہے کیونکہ فیکٹریوں، دفاتر، گھریلو ملازمت اور آن لائن فری لانس کام تک ہر جگہ یہی تعلق کارفرما ہے۔ اجرت میں تاخیر، طے شدہ سے کم ادائیگی، اوقات کار کی زیادتی، چھٹی اور علاج سے محرومی، اور دوسری طرف کام چوری، بددیانتی اور معاہدے کی خلاف ورزی جیسے مسائل عام ہیں۔ اسلامی تعلیمات ان تمام مسائل کا اخلاقی اور قانونی حل پیش کرتی ہیں۔ اس جواب میں پہلے اجارے کے تصور کی وضاحت کی جائے گی، پھر آجر کے فرائض اور اجیر کے حقوق، اس کے بعد اجیر کے فرائض اور آجر کے حقوق بیان ہوں گے اور آخر میں اس متوازن نظام کے معاشرتی اثرات پر روشنی ڈالی جائے گی۔

اجارے کا تصور اور معاہدے کی اہمیت

فقہی اصطلاح میں اجارہ اس معاہدے کو کہتے ہیں جس میں معلوم منفعت یا کام کے بدلے معلوم اجرت طے کی جائے۔ اس تعریف سے تین شرائط نکلتی ہیں۔ کام یا منفعت واضح ہو، مدت معلوم ہو اور اجرت پہلے سے متعین ہو۔ ان شرائط کا مقصد جھگڑے کی ہر صورت کو پہلے ہی ختم کرنا ہے۔ اسلام معاہدے کی پاسداری کو ایمان کا تقاضا قرار دیتا ہے اور وعدہ خلافی کو مذموم ٹھہراتا ہے۔ اس لیے آجر اور اجیر دونوں کے لیے لازم ہے کہ جو کچھ طے ہوا وہ تحریری یا واضح زبانی صورت میں ہو اور بعد میں یک طرفہ تبدیلی نہ کی

جائے۔ اگر حالات بدل جائیں تو ترمیم بھی باہمی رضامندی سے ہونی چاہیے۔ معاہدے کی یہ شفافیت جدید لیبر قوانین کی بھی بنیاد ہے اور اسلام نے اسے صدیوں پہلے اخلاقی اصول کے طور پر قائم کر دیا تھا۔

اسلام میں محنت کو عزت کا مقام حاصل ہے۔ ہاتھ سے کمانے والے کو اللہ کا محبوب قرار دینا اور مزدوری کو صدقے سے بہتر خودداری کا ذریعہ سمجھنا اس بات کی دلیل ہے کہ اجیر کوئی کمتر طبقہ نہیں بلکہ معاشرے کا معزز رکن ہے۔ اسی طرح آجر بھی سرمایہ کار بھی معاشرے کے لیے نفع بخش ہے کیونکہ وہ روزگار کے مواقع پیدا کرتا ہے۔ دونوں کا تعلق آقا و غلام کا نہیں بلکہ شراکت داروں کا ہے جن میں سے ہر ایک کی خدمات دوسرے کے لیے ضروری ہیں۔ اس باہمی احترام کی فضا میں جب حقوق و فرائض بیان کیے جاتے ہیں تو وہ بوجھ نہیں لگتے بلکہ نظام کو چلانے کا فطری تقاضا معلوم ہوتے ہیں۔ یہی ذہنی بنیاد آگے بیان ہونے والے تمام اصولوں کی روح ہے۔

آجر کے فرائض اور اجیر کے حقوق

آجر کا سب سے پہلا فرض اجرت کا بروقت اور مکمل ادا کرنا ہے۔ مزدور کی مزدوری اس کا پسینہ خشک ہونے سے پہلے دینے کی تاکید اسی اصول کی مشہور تعبیر ہے کہ اجرت میں تاخیر ظلم ہے۔ طے شدہ اجرت سے کم دینا، کٹوتیوں کے بہانے بنانا یا کام مکمل ہونے کے بعد شرائط بدل دینا بددیانتی ہے۔ دوسرا حق مناسب اجرت ہے جو کام، مہارت، مہنگائی اور عرف کے مطابق اتنی ہو کہ مزدور اپنی بنیادی ضروریات عزت سے پوری کر سکے۔ تیسرا حق کام کی معقول حد ہے۔ اجیر سے اس کی طاقت سے زیادہ کام لینا، مسلسل اضافی اوقات بغیر معاوضے کے لگانا یا بیماری و کمزوری کا لحاظ نہ کرنا شریعت کے احسان کے اصول کے خلاف ہے کیونکہ اسلام نے کسی جان کو اس کی وسعت سے زیادہ تکلیف دینے سے منع کیا ہے۔

جدول: آجر اور اجیر کے باہمی حقوق و فرائض کا خلاصہ

فریق	اہم حقوق	اہم فرائض
اجیر (مزدور / ملازم)	بروقت مکمل اجرت، آرام و چھٹی، عزت و تحفظ	دیانت، وقت کی پابندی، مہارت سے کام، رازداری

مناسب اجرت، انسانی سلوک، تحفظ کی فراہمی	معاہدے کے مطابق کام، امانت کی حفاظت	آجر (مالک / ادارہ)

اجیر کے دیگر حقوق میں آرام اور چھٹی کا حق، کام کی جگہ پر تحفظ اور عزت سے پیش آنے کا حق شامل ہے۔ خطرناک کاموں میں حفاظتی وسائل فراہم کرنا آجر کی ذمہ داری ہے کیونکہ انسانی جان مال سے قیمتی ہے۔ گالی گلوچ، تحقیر اور ذات پات کی بنیاد پر امتیاز اسلامی اخوت کے خلاف ہے۔ خواتین، کم عمر اور معذور کارکنوں کے لیے خصوصی رعایت بھی اسی احسان کا تقاضا ہے۔ بیماری یا حادثے کی صورت میں علاج میں معاونت اور مشکل وقت میں نرمی آجر کے اخلاقی فرائض میں شامل ہے۔ یہ حقوق جدید فلاحی لیبر قوانین سے پہلے اسلام کی تعلیمات میں موجود تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کے طرزِ عمل سے ثابت ہیں کہ ماتحتوں کے ساتھ شفقت کو قیادت کی زینت قرار دیا گیا ہے۔

اجیر کے فرائض اور آجر کے حقوق

حقوق کے ساتھ اجیر پر فرائض بھی عائد ہوتے ہیں۔ سب سے پہلا فرض دیانت اور امانت ہے۔ اجیر جس کام کی اجرت لیتا ہے اسے پوری توجہ اور مہارت سے کرنا اس پر لازم ہے۔ کام چوری، وقت ضائع کرنا، اوزار اور مال کی حفاظت نہ کرنا اور ادارے کے راز افشا کرنا خیانت کے زمرے میں آتا ہے۔ دوسرا فرض معاہدے کی پاسداری ہے۔ طے شدہ اوقات میں حاضر ہونا، مقررہ معیار برقرار رکھنا اور اجازت کے بغیر کام چھوڑ کر نہ جانا اس میں شامل ہے۔ تیسرا فرض آجر کے جائز حکم کی اطاعت ہے بشرطیکہ وہ حکم کسی گناہ یا ظلم پر مبنی نہ ہو۔ اگر حکم شریعت کے خلاف ہو تو اجیر اطاعت کا پابند نہیں رہتا کیونکہ مخلوق کی اطاعت خالق کی نافرمانی میں جائز نہیں۔ یہ حد بندی اجیر کی عزتِ نفس اور ضمیر دونوں کی حفاظت کرتی ہے۔

اجیر کا یہ بھی فرض ہے کہ وہ اپنے کام میں بہتری لانے کی کوشش کرے اور اپنے آپ کو نقصان دہ عادات سے بچائے۔ احسن طریقے سے کام کرنا اسلام میں احسان کہلاتا ہے اور یہ محض اخلاقی نصیحت نہیں بلکہ عبادت کا درجہ رکھتی ہے۔ اسی طرح اجیر کو چاہیے کہ اختلاف کی صورت میں پرامن اور قانونی طریقہ اختیار کرے، توڑ پھوڑ اور اجتماعی نقصان سے بچے اور ثالثی و مشاورت سے مسئلہ حل کرے۔ ہڑتال یا احتجاج جیسے معاملات میں بھی دوسروں کے حقوق اور عوامی مفاد کا لحاظ فقہی بحث کا حصہ رہا ہے۔ اصل اصول یہ ہے

کہ حق مانگنا جائز ہے لیکن طریقہ ظلم پر مبنی نہیں ہونا چاہیے۔ یوں اجیر کے فرائض پورے ہونے سے آجر کا کاروبار ترقی کرتا ہے اور اس ترقی کا فائدہ بالآخر کارکنوں کو بھی پہنچتا ہے۔

تنازعات کا حل اور ریاست کا کردار

اختلاف فطری ہے لیکن اس کا حل عدل سے ہونا چاہیے۔ اسلام تنازعات میں ثالثی، مشاورت اور قضا کے طریقے دیتا ہے۔ ریاست کا فرض ہے کہ وہ لیبر قوانین بنائے جن میں کم از کم اجرت، اوقات کار، چھٹی، حادثاتی معاوضہ اور ریٹائرمنٹ کے تحفظات واضح ہوں اور ان پر عمل درآمد یقینی بنائے۔ محتسب اور عدالت کو کمزور فریق کی دادرسی کے لیے قابل رسائی ہونا چاہیے۔ پاکستان سمیت مسلم ممالک میں موجود لیبر قوانین کی بہت سی دفعات انہی اصولوں سے ہم آہنگ ہیں، مسئلہ زیادہ تر نفاذ کا ہے۔ اگر آجر تنظیمیں اور مزدور یونینز دونوں اسلامی اخلاقیات کو سامنے رکھیں تو تصادم کے بجائے تعاون کی فضا بن سکتی ہے جو پیداوار اور فلاح دونوں کے لیے مفید ہے۔

اس متوازن نظام کا سب سے بڑا معاشرتی اثر یہ ہے کہ طبقاتی کشمکش کم ہوتی ہے۔ سرمایہ دار مزدور کو حریف نہیں شریک سمجھتا ہے اور مزدور مالک کو ظالم نہیں محسن سمجھتا ہے۔ کاروبار میں برکت اور اعتماد بڑھتا ہے، عملے کی وفاداری قائم رہتی ہے اور بار بار بھرتی و تربیت کے اخراجات کم ہوتے ہیں۔ جدید انتظامی علوم بھی اب یہی کہتے ہیں کہ مطمئن اور محفوظ کارکن زیادہ پیداواری ہوتا ہے۔ اسلام نے یہ اصول اخلاق اور ایمان کی بنیاد پر دیا تھا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسلامی تعلیمات صرف عبادات تک محدود نہیں بلکہ کاروبار اور روزگار جیسے عملی شعبوں میں بھی مکمل رہنمائی فراہم کرتی ہیں۔

نتیجہ

خلاصہ یہ ہے کہ اسلام میں آجر اور اجیر کا تعلق عدل، احسان اور معاہدے کی پاسداری پر قائم ہے۔ آجر کے فرائض میں بروقت و مناسب اجرت، معقول کام، آرام و تحفظ اور عزت سے سلوک شامل ہے جبکہ اجیر کے فرائض میں دیانت، امانت، مہارت، وقت کی پابندی اور جائز اطاعت شامل ہے۔ دونوں کے حقوق ایک دوسرے کے فرائض سے

جڑے ہوئے ہیں اور یہی توازن اس نظام کی خوبصورتی ہے۔ جب معاشرے میں یہ اصول زندہ ہوتے ہیں تو کارخانے اور دفاتر ظلم کے اڈے نہیں بنتے بلکہ رزق حلال اور باہمی تعاون کے مراکز بن جاتے ہیں۔ آج کے ملازمت پیشہ افراد اور کاروباری حضرات دونوں کے لیے ان تعلیمات پر عمل ہی پائیدار کامیابی اور ذہنی سکون کا ذریعہ ہے۔

سوال نمبر 4: کفالتِ عامہ کے تصور اور اس کی معاشی اہمیت پر نوٹ لکھیے۔ (20)

تعارف

کفالت عامہ سے مراد یہ ہے کہ معاشرے کے ہر فرد کی بنیادی ضروریات کی تکمیل کی ذمہ داری اجتماعی طور پر قبول کی جائے اور کوئی شخص خوراک، لباس، رہائش، تعلیم اور علاج جیسی بنیادی سہولتوں سے محروم نہ رہے۔ اسلام نے اس تصور کو محض خیراتی جذبے تک محدود نہیں رکھا بلکہ اسے نظام کی صورت دی ہے جس میں فرد، خاندان، معاشرہ اور ریاست سب اپنے اپنے دائرے میں ذمہ دار ہیں۔ اس کی بنیاد یہ عقیدہ ہے کہ مال اللہ کی عطا ہے اور اس میں بے سہارا لوگوں کا حق شامل ہے۔ جو شخص آج صاحب حیثیت ہے کل اسے بھی سہارے کی ضرورت پڑ سکتی ہے اس لیے کفالت کا نظام دراصل پورے معاشرے کا باہمی بیمہ ہے۔ اس نوٹ میں کفالت عامہ کے مفہوم، اس کے درجات و ذرائع اور اس کی معاشی اہمیت کو واضح کیا جائے گا۔

جدید فلاحی ریاست کا تصور بھی اسی سوچ کے قریب ہے کہ شہریوں کو بنیادی تحفظ فراہم کرنا ریاست کی ذمہ داری ہے، لیکن اسلام نے یہ تصور ریاست سے پہلے خاندان اور معاشرے کی سطح پر قائم کیا اور اسے عبادت و ثواب سے جوڑ دیا۔ اس سے نظام صرف بجٹ پر منحصر نہیں رہتا بلکہ لاکھوں افراد کی رضاکارانہ شرکت سے چلتا ہے۔ زکاۃ، صدقات، اوقاف، نفقہ خویش و اقارب اور بیت المال اس نظام کے معروف ادارے ہیں۔ ان اداروں کے باہمی ربط کو سمجھے بغیر کفالت عامہ کی معاشی اہمیت پوری طرح واضح نہیں ہوتی، اس لیے آئندہ سطور میں ہر پہلو کو الگ عنوان کے تحت بیان کیا گیا ہے۔

کفالت کے درجات اور ذمہ داران

کفالت کا پہلا درجہ خود انسان کی اپنی محنت ہے۔ اسلام ہر صاحب استطاعت کو کمائی کی ترغیب دیتا ہے اور بلا ضرورت سوال کرنے کو ناپسند کرتا ہے۔ دوسرا درجہ خاندان ہے۔ والدین، اولاد اور قریبی رشتہ داروں کا نفقہ شرعاً مقرر ہے تاکہ کمزور فرد سب سے پہلے اپنے قریبی حلقے سے باعزت مدد پائے۔ تیسرا درجہ معاشرہ ہے۔ ہمسایوں، اہل محلہ اور صاحب ثروت افراد کی ذمہ داری ہے کہ وہ زکاۃ و صدقات کے ذریعے ضرورت مندوں تک پہنچیں۔ چوتھا اور آخری درجہ ریاست اور بیت المال ہے۔ جب خاندان اور معاشرہ کسی فرد کی کفالت سے قاصر ہوں یا فرد کا کوئی سہارا ہی نہ ہو تو ریاست آگے بڑھ کر اس کی بنیادی ضروریات پوری کرتی ہے۔ خلافت راشدہ کی تاریخ میں اس اصول کی عملی مثالیں ملتی ہیں جہاں ریاست نے بوڑھوں، یتیموں اور معذوروں کے وظائف مقرر کیے۔

ان درجات کی ترتیب بڑی حکمت رکھتی ہے۔ اس سے ریاست پر غیر ضروری بوجھ نہیں پڑتا، خاندانی نظام مضبوط رہتا ہے اور مدد لینے والے کی عزت نفس بھی کم سے کم متاثر ہوتی ہے کیونکہ قریبی سے مدد لینا اجنبی ادارے سے لینے کی نسبت آسان ہوتا ہے۔ ساتھ ہی یہ ترتیب اس بات کی ضمانت بھی ہے کہ کوئی فرد اس جال سے نیچے نہ گرے۔ اگر ایک درجہ ناکام ہو تو دوسرا موجود ہے۔ جدید سماجی تحفظ کے ماہرین بھی اسی کثیر سطحی نظام کی سفارش کرتے ہیں۔ اسلام نے اس میں روحانی محرک مزید شامل کر دیا ہے کہ مدد کرنے والا اجر پاتا ہے اور مدد لینے والا احسان کے بجائے حق وصول کرتا ہے۔ یہ نفسیاتی فرق نظام کو دیرپا اور باعزت بناتا ہے۔

کفالت کے ادارے: زکاۃ، وقف اور بیت المال

کفالت عامہ کا سب سے منظم ادارہ زکاۃ ہے۔ یہ صاحب نصاب مسلمانوں پر فرض ہے اور اس کے مصارف قرآن نے واضح طور پر مقرر کر دیے ہیں جن میں فقراء، مساکین، مقروض اور مسافر وغیرہ شامل ہیں۔ زکاۃ کی ادائیگی سالانہ اور مال کے تناسب سے ہوتی ہے اس لیے یہ غربت کے خلاف ایک مسلسل مالیاتی بہاؤ ہے۔ وقف دوسرا اہم ادارہ ہے جس میں کوئی شخص اپنی جائیداد کا فائدہ ہمیشہ کے لیے تعلیم، صحت، پانی یا مسافروں کی سہولت جیسے فلاحی کاموں کے لیے وقف کر دیتا ہے۔ تاریخ اسلام میں وقف کے ذریعے

جامعات، اسپتال، سرائے اور کنویں صدیوں چلتے رہے۔ بیت المال ریاست کا خزانہ ہے جو زکاۃ کے علاوہ دیگر آمدنیوں سے ان افراد کی مدد کرتا ہے جن کا کوئی پرسان حال نہ ہو۔

صدقہ فطر، کفارات، نذر اور عام صدقات بھی اس نظام کو تقویت دیتے ہیں۔ ان ذرائع کی خوبی یہ ہے کہ یہ صرف نقد رقم نہیں دیتے بلکہ بسا اوقات روزگار کے وسائل بھی فراہم کرتے ہیں۔ فقہا نے اس اصول کی طرف رہنمائی کی ہے کہ مستحق کو اتنا دیا جائے کہ وہ خود کفیل ہو جائے، جیسے کاریگر کو اوزار یا چھوٹے تاجر کو سرمایہ فراہم کر دیا جائے۔ یہی تصور آج کے بلاسود مائیکرو فنانس اور ہنر مندی پروگراموں کی بنیاد ہے۔ یوں اسلامی نظام وقتی مدد کے بجائے مستقل بحالی کو ہدف بناتا ہے۔ اس سے مستحقین کی تعداد بتدریج کم ہوتی ہے اور وہ خود دینے والوں میں شامل ہونے لگتے ہیں، جو کسی بھی معیشت کے لیے صحت مند علامت ہے۔

معاشی اہمیت: گردش دولت اور طلب میں استحکام

کفالت عامہ کی سب سے بڑی معاشی اہمیت دولت کی گردش ہے۔ امیروں کے پاس جمع دولت جب زکاۃ و صدقات کے ذریعے غریبوں تک پہنچتی ہے تو وہ بازار میں طلب بن کر واپس آتی ہے۔ غریب اپنی آمدن کا بیشتر حصہ بنیادی ضروریات پر فوراً خرچ کرتا ہے جس سے مقامی تجارت، زراعت اور صنعت کو فروغ ملتا ہے۔ اس کے برعکس دولت اگر چند ہاتھوں میں جم جائے تو طلب سست پڑتی ہے اور معیشت کساد کا شکار ہو سکتی ہے۔ جدید معاشیات میں بھی منتقلی ادائیگیوں کو طلب برقرار رکھنے کا ذریعہ تسلیم کیا گیا ہے۔ اسلامی کفالت یہ کام بغیر سودی قرضوں اور بغیر بھاری ٹیکس مشینری کے رضاکارانہ دینی جذبے سے کرتی ہے، اس لیے اس کی انتظامی لاگت بھی نسبتاً کم ہوتی ہے۔

جدول: کفالت عامہ کے معاشی اثرات

اثر	پہلو
زکاۃ و صدقات سے دولت نچلے طبقات تک پہنچتی ہے	گردش دولت
غریب کی کھپت سے بازار کی طلب برقرار رہتی ہے	طلب میں استحکام

تعلیم وعلاج کی مدد سے پیداواری صلاحیت بڑھتی ہے	انسانی سرمایہ
غربت، جرم اور بے چینی میں کمی آتی ہے	سماجی استحکام
روزگار وسائل کی [illegible] مستحق دینے والا بنتا ہے	خود کفالت

دوسرا معاشی فائدہ انسانی سرمائے کی حفاظت ہے۔ بھوک، بیماری اور جہالت مزدور کی پیداواری صلاحیت ختم کر دیتی ہے۔ کفالت کے ذریعے علاج، خوراک اور بچوں کی تعلیم ملنے سے اگلی نسل ہنر مند اور صحت مند ہوتی ہے۔ تیسرا فائدہ سماجی استحکام ہے۔ جہاں غربت بے قابو ہو وہاں چوری، بھیک، نشہ اور جرائم بڑھتے ہیں جن پر ریاست کو پولیس اور جیلوں کی مد میں بھاری خرچ کرنا پڑتا ہے۔ کفالت جرائم کی جڑ کاٹتی ہے اس لیے یہ خرچ دراصل بچت ہے۔ چوتھا فائدہ معاشی جھٹکوں میں تحفظ ہے۔ بیماری، حادثہ یا بیروزگاری کی صورت میں کفالت کا جال فرد کو مکمل تباہی سے بچاتا ہے اور معیشت جلد بحال ہوتی ہے۔ یہ تمام فوائد مل کر کفالت عامہ کو خیرات نہیں بلکہ دانشمندانہ معاشی پالیسی ثابت کرتے ہیں۔

کفالت عامہ اور جدید فلاحی نظام کا تعلق

آج پاکستان جیسے ممالک میں بینظیر انکم سپورٹ، احساس پروگرام، بیت المال اور مختلف فلاحی ادارے اسی تصور کی جدید صورتیں ہیں۔ اسلامی نقطہ نظر سے ان پروگراموں کو مزید بہتر بنانے کے لیے شفافیت، مستحق تک رسائی، عزت نفس کا تحفظ اور روزگار سے جوڑنا ضروری ہے۔ زکاۃ کے نظام کو جدید ڈیٹا اور آڈٹ کے ساتھ منظم کیا جائے تو اس کی استعداد میں کئی گنا اضافہ ہو سکتا ہے۔ اوقاف کی بحالی سے تعلیم و صحت کے بڑے ادارے سرکاری بجٹ کے بغیر بھی چل سکتے ہیں جیسا کہ ماضی میں ہوتا رہا ہے۔ اس کے لیے قانونی اصلاحات اور دیانت دار انتظام شرط ہے۔ پرائیویٹ فلاحی تنظیمیں بھی اسی کفالت نظام کی جدید توسیع ہیں جن کی حوصلہ افزائی ہونی چاہیے۔

یہ بھی یاد رہے کہ کفالت عامہ کا مقصد لوگوں کو کام سے بے نیاز کر کے سستی کا عادی بنانا نہیں ہے۔ اسلام نے محنت کو عبادت اور سوال کو ناپسندیدہ قرار دے کر توازن قائم رکھا ہے۔ کفالت صرف ناگزیر ضرورت، عارضی مجبوری اور خود کفالت تک پہنچنے کے سفر کے لیے ہے۔ اس لیے مستحقین کی تربیت، ہنر اور روزگار کی تلاش میں مدد اس نظام کا

لازمی حصہ ہے۔ یہ متوازن سوچ کفالت کو مغربی فلاحی نظام کی بعض کمزوریوں سے بھی بچاتی ہے جہاں بعض صورتوں میں مستقل انحصار پیدا ہو جاتا ہے۔ اصل ہدف ہر فرد کو باعزت روزگار کے قابل بنانا اور ناگزیر حالات میں اسے گرنے نہ دینا ہے۔

نتیجہ

مختصر یہ کہ کفالت عامہ اسلام کے معاشی نظام کا دل ہے۔ یہ تصور خاندان سے ریاست تک پھیلی ہوئی ذمہ داری، زکاۃ و وقف و بیت المال جیسے اداروں اور محنت و خودداری کے توازن پر قائم ہے۔ اس کی معاشی اہمیت دولت کی گردش، طلب کے استحکام، انسانی سرمائے کی حفاظت، جرائم میں کمی اور معاشی جھٹکوں سے تحفظ کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔ جو معاشرہ کفالت عامہ کو زندہ رکھتا ہے وہاں غربت قابل انتظام رہتی ہے، بازار چلتا ہے اور دلوں میں باہمی ہمدردی قائم رہتی ہے۔ اس نظام کا احیا آج کے معاشی مسائل خصوصاً غربت اور عدم مساوات کا ایک آزمودہ اور اخلاقی بنیادوں پر قائم حل ہے۔

سوال نمبر 5: اسلام میں زمین کی ملکیت کے اصول اور اس کی حدود کو واضح کیجیے۔ (20)

تعارف

زمین معیشت کے بنیادی عوامل پیداوار میں سب سے اہم ہے کیونکہ زراعت، رہائش، صنعت اور تجارت سب کا انحصار اسی پر ہے۔ اسلام نے زمین کی ملکیت کے بارے میں ایسا متوازن نظام دیا ہے جو نہ سرمایہ دارانہ نظام کی طرح زمین کو چند بڑے جاگیرداروں کے پاس مرتکز ہونے دیتا ہے اور نہ اشتراکی نظام کی طرح فرد کی جائز ملکیت ہی ختم کرتا ہے۔ اس نظام کی بنیاد یہ اصول ہے کہ زمین سمیت تمام وسائل کا مالک حقیقی اللہ تعالیٰ ہے اور انسان کو ملکیت بطور امانت اور مقررہ شرائط کے ساتھ حاصل ہوتی ہے۔ اس لیے مالک کو حق استعمال بھی ہے اور اس پر ذمہ داریاں بھی عائد ہیں۔ اس جواب میں زمین کی ملکیت کے قرآنی و فقہی اصول، ملکیت کی اقسام، اس پر عائد حدود اور آبادکاری کے احکام کو تفصیل سے بیان کیا جائے گا۔

پاکستان اور دیگر مسلم معاشروں میں زمین کا مسئلہ آج بھی مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔ بڑی جاگیریں، بنجر پڑی زمینیں، ہاری اور مزارع کے مسائل، شہری زمینوں کی قیاسی قیمتیں اور قبضہ گروپ یہ سب اسی سوال سے جڑے ہیں کہ زمین کی ملکیت کتنی ہو، کیسی ہو اور اس پر معاشرے کا حق کتنا ہے۔ اسلامی اصول ان مسائل پر بنیادی رہنمائی فراہم کرتے ہیں۔ یہ تعلیمی وضاحت عام اصولوں تک محدود ہے۔ کسی مخصوص زمینی تنازعے کا فیصلہ عدالتوں اور مستند قانونی و شرعی ماہرین کا کام ہے۔ اصولوں کو سمجھنے سے طالب علم کو زرعی اصلاحات اور لینڈ پالیسی کے جائزے کا معیار مل جاتا ہے۔

بنیادی اصول: حقیقی ملکیت، امانت اور استخلاف

زمین کی ملکیت کا پہلا اصول یہ ہے کہ ملکیت حقیقی اللہ کے لیے ہے اور انسانی ملکیت عارضی و امانتی ہے۔ قرآن کریم جگہ جگہ آسمانوں اور زمین کی ملکیت اللہ کے لیے ثابت کرتا ہے۔ اس اصول کا عملی مطلب یہ ہے کہ مالک زمین کو اللہ کی مقرر کردہ حدود سے باہر استعمال نہیں کر سکتا۔ وہ زمین سے خود بھی فائدہ اٹھائے اور دوسروں کو ناجائز ضرر نہ پہنچائے۔ دوسرا اصول استخلاف ہے یعنی انسان زمین پر خلیفہ ہے۔ خلیفہ کا کام زمین کو آباد کرنا، اس کی صلاحیت کو انسانیت کے فائدے کے لیے استعمال کرنا اور آئندہ نسلوں کے حق کا لحاظ رکھنا ہے۔ اسی سے ماحولیاتی تحفظ کا جدید تصور بھی جڑتا ہے کہ زمین کو برباد کر کے چھوڑ دینا امانت میں خیانت ہے۔

تیسرا اصول یہ ہے کہ اسلام نجی ملکیت کو تسلیم کرتا ہے۔ جائز خرید و فروخت، وراثت، ہبہ اور آبادکاری سے حاصل شدہ ملکیت محترم ہے اور ریاست یا کوئی فرد اسے بغیر شرعی و قانونی سبب کے ختم نہیں کر سکتا۔ مال کی حرمت کو جان کی حرمت کے ساتھ بیان کرنا اسی تحفظ کی دلیل ہے۔ چوتھا اصول یہ ہے کہ ملکیت کے ساتھ سماجی حق وابستہ ہے۔ عشر و خراج کی ادائیگی، ضرورت کے وقت عوامی مفاد کے لیے زمین کا حصول بمعاوضہ، راستوں اور پانی کے قدرتی حقوق کا احترام یہ سب اسی حق کی صورتیں ہیں۔ یوں اسلامی ملکیت مطلق حق نہیں بلکہ حقوق و فرائض کا مجموعہ ہے۔ یہ توازن ہی اس نظام کو دوسرے نظاموں سے ممتاز کرتا ہے۔

ملکیت کی اقسام اور احیائے موات

فقہا نے زمینوں کی مختلف اقسام بیان کی ہیں۔ ایک وہ زمین جو کسی فرد کی ملکیت میں آباد ہے اور جس پر اس کے حقوق واضح ہیں۔ دوسری وہ زمین جو وقف ہے اور کسی فلاحی مقصد کے لیے مخصوص ہے۔ تیسری وہ زمین جو ریاست کی نگرانی میں عوامی مفاد کے لیے محفوظ ہے جیسے چراگاہیں، جنگلات اور عوامی راستے، جنہیں حمیٰ کہا جاتا ہے۔ چوتھی بنجر و غیر آباد زمین ہے جسے موات کہتے ہیں۔ ان اقسام کو الگ الگ سمجھنا ضرور ہے کیونکہ ہر قسم کے احکام الگ ہیں۔ عوامی زمینوں پر ناجائز قبضہ غصب کے حکم میں آتا ہے جبکہ نجی آباد زمین کا احترام لازم ہے۔ ریاست کا فرض ہے کہ ریکارڈ اور حد بندی کے ذریعے یہ فرق واضح رکھے تاکہ تنازعات کم ہوں۔

احیائے موات یعنی بنجر زمین کو آباد کرنے کا اصول اسلام کی زرعی پالیسی کا اہم ستون ہے۔ فقہی قاعدہ ہے کہ جو شخص بے مالک بنجر زمین کو ریاست کی اجازت اور مقررہ شرائط کے ساتھ آباد کرے وہ اس پر ملکیت یا حق تصرف حاصل کرتا ہے۔ اس اصول کی حکمت یہ ہے کہ زمین بیکار نہ پڑی رہے اور آبادکار کی محنت کا اسے پھل ملے۔ ساتھ ہی فقہا نے یہ حد بھی لگائی ہے کہ جس نے زمین گھیر کر آباد کیے بغیر چھوڑ دی اور مدت گزر گئی تو ریاست اسے دوسرے آبادکار کو دے سکتی ہے۔ یہ اصول بڑے بڑے رقبے محض قیمت بڑھنے کے انتظار میں روک رکھنے کی حوصلہ شکنی کرتا ہے اور زمین کو پیداوار میں لانے کی ترغیب دیتا ہے۔ آج کے لینڈ ریکارڈ اور آبادکاری اسکیموں میں بھی یہی روح کارفرما ہونی چاہیے۔

ملکیت کی حدود: ارتکاز کی ممانعت، ضرر کی روک تھام اور مالی واجبات

اسلام میں زمین کی ملکیت پر کئی حدود عائد ہیں۔ پہلی حد یہ ہے کہ ملکیت حاصل کرنے کا ذریعہ جائز ہو۔ غصب، دھوکے، جعلی انتقال اور قبضے سے حاصل زمین شرعاً ملکیت نہیں بنتی۔ دوسری حد استعمال سے متعلق ہے کہ مالک اپنی زمین سے دوسروں کو ضرر نہ پہنچائے۔ مثلاً پانی کا قدرتی بہاؤ روک کر ہمسایہ کی فصل تباہ کرنا یا فیکٹری کا فضلہ زمین و پانی میں چھوڑنا اسی میں آتا ہے۔ تیسری حد یہ ہے کہ زمین کو پیداوار سے روک کر مصنوعی قلت اور قیاسی منافع کمانا پسندیدہ نہیں۔ چوتھی حد مالی واجبات ہیں۔ زرعی زمین پر عشر یا خراج کا نظام، شہری جائیداد پر زکاۃ کے احکام جہاں لاگو ہوں اور دیگر جائز محصولات اس بات کی علامت ہیں کہ زمین کی آمدن میں معاشرے کا حصہ شامل ہے۔

جدول: زمین کی ملکیت، اصول اور حدود

مطلب	اصول / حد
انسان امین رضائیہ ہے، ملکیت مطلق نہیں	حقیقی ملکیت اللہ کی
جائز ملکیت بغیر سبب ختم نہیں کی جا سکتی	نجی ملکیت کا تحفظ
آباد کار کو حق ملتا ہے، روک رکھنا ناپسندیدہ ہے	احیائے موات
زمین کے استعمال سے دوسرے کو نقصان نہ ہو	لاضرر
عشر، خراج اور عوامی حق کی ادائیگی	مالی واجبات

ایک اہم بحث زمین کی زیادہ سے زیادہ مقدار کی ہے۔ اسلام نے رقبے کی کوئی جامد عددی حد مقرر نہیں کی لیکن ارتکاز کو روکنے کے کئی عملی ذرائع دیے ہیں۔ وراثت کا نظام بڑی جائیداد کو ہر نسل میں تقسیم کرتا ہے، زکاۃ و عشر سالانہ حصہ نکالتے ہیں، بنجر روکنے پر حق ختم ہو سکتا ہے اور ریاست عوامی مفاد میں بمعاوضہ حصول اور زرعی اصلاحات کے عمومی اصولوں کے تحت اقدامات پر غور کر سکتی ہے جس کی تفصیلات فقہا و اہل قانون کے اجتہادی مباحث میں ملتی ہیں۔ ان ذرائع کے مجموعے سے نظام بتدریج ارتکاز کم کرتا ہے اور چھوٹے کسان کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ طالب علم کو یہ نکتہ سمجھنا چاہیے کہ اسلام کا طریقہ جامد اعلان کے بجائے مسلسل اصلاحی عمل ہے۔

مزارعت اور کسان کے حقوق

زمین کی ملکیت کے ساتھ اس پر کاشت کرنے والے کا مسئلہ بھی جڑا ہے۔ اسلام نے مزارعت یعنی بٹائی پر کاشت کے معاہدات کو واضح شرائط کے ساتھ جائز رکھا ہے بشرطیکہ حصہ داری معلوم ہو، مدت طے ہو اور ظلم نہ ہو۔ کسان اور مزارع کی محنت کا استحصال، بے دخلی کی دھمکی، بیگار اور پیداوار میں دانستہ ناانصافی اسلامی عدل کے خلاف ہے۔ نبی

کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں مدینہ و خیبر کے زرعی معاہدات اس بات کی مثال ہیں کہ زمین دار اور کاشتکار دونوں کا حصہ طے کر کے معاملہ چلایا گیا۔ اس سے یہ اصول نکلتا ہے کہ زمین کی ملکیت باعزت ہے لیکن اس سے جڑا ہر معاہدہ بھی عدل پر مبنی ہونا چاہیے اور ریاست کا فرض ہے کہ وہ کمزور کاشتکار کو قانونی تحفظ دے۔

موجودہ دور میں زرعی اصلاحات، حد بندی قوانین اور کسان کو ملکیت دینے کی اسکیمیں اسی پس منظر میں دیکھی جاتی ہیں۔ ان اصلاحات کی کامیابی کا اسلامی معیار یہ ہے کہ پیداوار بڑھے، کسان خوشحال ہو، خوراک کی فراہمی بہتر ہو اور کسی کے جائز حق پر شب خون نہ مارا جائے۔ جہاں بڑی زمینیں بنجر اور مزارع بے حال ہوں وہاں اصلاح کی گنجائش واضح ہے، اور جہاں اصلاح کے نام پر جائز ملکیت ختم ہو وہاں بھی توازن بگڑتا ہے۔ یہ تعلیمی تجزیہ ہے؛ مخصوص قوانین کی شرعی و قانونی حیثیت کا حتمی جائزہ ماہرین قانون و شریعت اور عدالتوں کا کام ہے، طالب علم کو اصول اور مقصد سامنے رکھ کر مطالعہ کرنا چاہیے۔

نتیجہ

خلاصہ یہ ہے کہ اسلام میں زمین کی ملکیت کا نظام امانت و استخلاف کے عقیدے، نجی ملکیت کے تحفظ، آبادکاری کی ترغیب اور سخت سماجی حدود کے امتزاج پر قائم ہے۔ مالک حقیقی اللہ ہے، انسان امین ہے، جائز ملکیت محترم ہے، مگر غصب ناجائز، ضرر ممنوع، بنجر روکنا ناپسندیدہ اور عشر و خراج جیسے واجبات لازم ہیں۔ مزارع کے حقوق اور عوامی زمینوں کا تحفظ بھی اسی نظام کا حصہ ہے۔ یہ اصول آج کی زرعی پالیسی، لینڈ ریکارڈ کی شفافیت، قبضہ مافیا کے خاتمے اور کسان کی فلاح کے لیے مضبوط اخلاقی و فقہی بنیاد فراہم کرتے ہیں۔ زمین کو امانت سمجھنے والا معاشرہ ہی اس سے انصاف کے ساتھ فائدہ اٹھا سکتا ہے اور آنے والی نسلوں کے لیے اسے محفوظ رکھ سکتا ہے۔